

مولانا مودودیؒ کو سزائے موت اور رحم کی اپیل سے انکار

پروفیسر خورشید احمد

جرم و سزا کے تعلق سے کم از کم تین پہلو ایسے ہیں جن کا فہم ضروری ہے:
ایک خالص قانونی پہلو ہے۔ اگر کسی نے جرم کیا ہے اور اس کو قانون کے مطابق سزا ملتی ہے تو یہ اس کے جرم کا فطری انجام ہے۔

اگر مجرم کو اپنی غلطی کا احساس اور اعتراف ہوتا ہے، اور وہ سزا کے ساتھ اپنے رب اور ان افراد سے جن کے حقوق پر اس نے ڈاکا ڈالا ہے، خلوص نیت سے معافی طلب کرتا ہے تو وہ اخلاقی طور پر اپنے آپ کو سدھارنے (rehabilitate) کے عمل کا آغاز کرتا ہے اور اس طرح اپنے دامن کے داغ دھو کر ایک نئی صاف ستھری زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

جرم و سزا کے تعلق کی ایک تیسری شکل بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص نے کوئی جرم نہ کیا ہو، مگر اس معصوم انسان کو ظلم کا نشانہ بنایا جائے اور ایسی سزا دی جائے جس کا وہ مستحق نہیں، تو اس سزا کا سارا وبال ان ظالموں پر ہے، جو ایک معصوم انسان پر یہ ظلم ڈھاتے ہیں اور مظلوم اس کی سزا بھگتتا ہے اور وہ اخلاقی و روحانی، ہر اعتبار سے کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ اگر اس کی جان بھی تلف کر دی جائے، تو وہ شہادت اور حیات جاودانی سے شاد کام ہوتا ہے۔

یہ انسان کے لیے بڑا سخت امتحان ہے لیکن ہماری تاریخ اللہ کے ان نیک بندوں سے بھری پڑی ہے، جنہوں نے ظلم کے ہر وار کو برداشت کیا، لیکن ظلم کے آگے سر نہ جھکایا۔ اس کی تازہ ترین مثالیں بنگلہ دیش کی جماعت اسلامی کی قیادت کے دو گلہاے سرسید نے پیش کی ہیں، یعنی محترم عبدالقادر مٹا شہید اور محترم محمد قمر الزمان شہید۔ ان کو انصاف کا قتل کرتے ہوئے سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا گیا اور دین حق کے سپاہی، تحریک اسلامی کے کارکن اور پاکستان کے نظریے سے وفاداری

کی پاداش میں موت کی سزا دی گئی۔ انھیں لالچ بھی دیا گیا کہ ظالم حکمرانوں سے معافی کی درخواست کر دو تو سزائے موت سے بچ سکتے ہو، لیکن انھوں نے اللہ اور حق سے وفاداری کو، محض جان بچانے کے لیے جھوٹے الزامات کو اڑھنے اور ظالموں سے رحم کی اپیل کرنے پر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دینے کو ترجیح دی اور اس طرح اہل حق کے لیے ایک اور روشن اور تابناک مثال رقم کر دی۔ سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں اس موقع پر جماعت اسلامی کے بانی امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی مثال بھی ذہنوں میں تازہ کیجیے۔ آپ کو اپنی روح و جد کرتی ہوئی محسوس ہوگی۔ بانی جماعت کو مئی ۱۹۵۳ء میں لاہور کی مارشل لا کورٹ نے قادیانی مسئلہ نامی کتابچہ لکھنے کی پاداش میں موت کی سزا سنائی اور مولانا کو پھانسی کے احاطے میں منتقل کر دیا گیا، اور پھر انھیں پیغام دیا گیا کہ اگر آپ رحم کی اپیل کریں تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔

مولانا محترم نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ: ”اگر میرا وقت آ گیا ہے تو کوئی مجھے بچا نہیں سکتا، اور اگر میرا وقت نہیں آیا تو یہ لوگ اُلٹے بھی لٹک جائیں تو میرا کوئی نقصان نہیں کر سکتے“۔ انھوں نے اپنی اہلیہ، اولاد اور ذمہ داران جماعت کو بھی مشورہ دیا کہ کوئی کسی بھی شکل میں رحم کی اپیل نہ کرے اور فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ پھر ملک اور عالم اسلام میں شدید رد عمل کے دباؤ میں حکومت نے سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔

میں اُس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کا ناظم تھا اور ہم نے کراچی میں بڑے پیمانے پر احتجاج کیا۔ ایئر پورٹ پر اس وقت کے وزیراعظم محمد علی بوگرا کے خلاف حکومت کی ساری پیش بند یوں کے باوجود بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس لمحے ہم نے برادر عزیز ظفر اسحاق انصاری کو لاہور روانہ کیا تاکہ مرکزی نظم سے رابطہ قائم کریں اور اگر ممکن ہو تو خود مولانا محترم سے بھی ملنے کی کوشش کریں۔ چند احباب کے تعاون سے ظفر اسحاق بھائی، محترم مولانا مودودی سے سزائے موت کے عمر قید میں تبدیل ہونے کے اگلے ہی دن جیل میں ان سے ملے، اور ان سے یہ سوال کیا کہ: ”آپ نے رحم کی اپیل کیوں نہیں کی؟“ یہ تاریخی گفتگو ظفر اسحاق انصاری نے میرے اصرار پر میرے گھر اپنی آواز میں محفوظ کرا دی ہے، جسے ہدیہ ناظرین کیا جا رہا ہے:

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے روایت کی ہے: ”مئی ۱۹۵۳ء میں، اچانک یہ خبر آئی کہ مولانا مودودیؒ کو سزائے موت سنادی گئی ہے، تو خورشید بھائی اور خرم بھائی کے مشورے سے میں (کراچی سے) لاہور گیا، اور لاہور میں ایف سی کالج میں مقیم ہوا۔ اللہ کا شکر ہے کہ جلد ہی جو سزا سنائی گئی تھی، اسے سزائے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح ہم نے بھی ایک لحاظ سے اطمینان کا سانس لیا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ تاریخ کون سی تھی، لیکن سزائے موت منسوخ ہونے کے زیادہ سے زیادہ ایک دن بعد، ایک صبح اپنے دوست کی مدد سے میں بورٹل جیل گیا، جہاں مولانا مودودی قید تھے۔ مولانا محترم اپنے معمول کے لباس میں ملبوس نہیں تھے، یعنی جیل ہی کا دیا ہوا لباس پہنے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگے کہ: ”بھئی آپ کیسے یہاں آ گئے؟“

میں نے ان سے کہا کہ: ”مولانا! میں نے سنا تھا کہ آپ کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ سزائے موت کے بارے میں آپ رحم کی اپیل کریں۔ یہ تجویز جو دی گئی تو آپ نے کیا محسوس کیا؟“

بالکل غیر جذباتی انداز میں انھوں نے کہا کہ جب یہ بات کہی گئی تو میرے دماغ میں معاً تین باتیں آئیں:

- پہلی بات یہ تھی کہ میں شہادت کا مستحق ہوں یا نہ ہوں، یہ چیز لگتا ہے کہ اب میرے نصیب میں ہے، یعنی میرے لیے اس کا موقع ہے۔ پہلے خیال آیا کہ اتنی بڑی چیز سے میں خود دست کش ہو جاؤں اور کہوں کہ یہ مجھے نہیں چاہیے، تو یہ بڑی عجیب سی بات ہوگی۔
- دوسرے یہ کہ اس ظالمانہ حکم کے خلاف رحم کی اپیل کرنا، میرے لیے عزت نفس کی بھی بات ہے اور میں اس کے لیے تیار نہیں پاتا کہ اس کو قربان کر دوں۔
- تیسری یہ کہ سب کچھ جانتے ہوئے کہ یہ لوگ ظلم کے طور پر یہ اقدام کرنا چاہتے ہیں، اس کے خلاف رحم کی اپیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی پوری قوم کو شرم و حیا کے جذبات سے عاری کر دوں۔

— اور مسکرا کر کہنے لگے کہ میں نہیں سمجھتا کہ اپنی قوم کو یہ سزا دوں۔
یہ مختصر سی گفتگو تھی جو دو یا تین منٹ کی تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ انھی الفاظ میں اسے یادداشت سے بیان کر دوں۔